اسلام میں عورت کی گواہی

اعتراضات اور جوابات

محمد رفیق چوہدری

ہمارے ملک میں حکومت کی جانب سے موجودہ قانون سازی کی مہم میں ایک اہم بحث عورت کی شہادت کا مسئلہ ہے - جہاں تک اسلامی قانون میں عورت کی شہادت کا تعلق ہے تو اس بارے میں قرآن وسنت کے واضح احکام موجود ہیں کہ مالی معاملات میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر تسلیم کیا گیا ہے - گویا تمام مالی معاملات میں ایک عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف شمار ہوتی ہے -

قرآن میں عورت کی گواہی

قرآن حکیم میں صریح طور پر عورت کی شہادت سے متعلق اللہ تعالٰے کا ارشاد یہ ہے :

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ
مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ
يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ
امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ
مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ
اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ
اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰی -

اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو
مردوں کو گواہ ٹھہرا لو، پھر اگر دو
مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو
عورتیں ہوں - یہ گواہ تمہاری
پسند کے ہوں - دو عورتیں اس
لئے کہ ایک بھول جائے تو دوسری
یاد دلائے -

(البقرہ آیت ۲۸۲)

سیاقِ کلام میں آیت بالا کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو مالی معاملات میں یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ جب کبھی آپس میں قرض کا کوئی لین دین کریں تو ایسے معاملے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

کا ایک تو تحریر میں لایا جانا ضروری ہے اور دوسرے یہ کہ قرض کی ایسی دستاویز پر شہادت قائم ہونی ضروری ہے ۔ یہ گواہی دو مردوں کی گواہی ہوگی اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی بھی ہوسکتی ہے ۔ یہ گواہ عادل ہونے چاہئیں ۔ جس کی طرف واضح اشارہ آیت کے الفاظ "مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ" (یہ گواہ تمہاری پسند کے ہوں) میں موجود ہے ۔ پھر آخر میں اللہ تعالیٰ نے ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کو گواہ بنانے کی علت وحکمت یہ بیان فرمائی کہ "ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلائے"۔

اس آیت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ تمام مالی معاملات میں شہادت کا نصاب دو مرد ہیں یا پھر ایک مرد اور دو عورتیں ہیں ۔

© rasailojaraid.com

اُمّت کے تمام فقہاء اور مفسرین اسی مفہوم پر متفق ہیں اور اس مفہوم سے کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے ۔

حدیث میں عورت کی گواہی

جہاں تک حدیث میں عورت کی گواہی کا تعلق ہے تو اس بارے میں صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ:

فشهادة امرأتين تعدل شهادة رجل ۔ — دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے ۔

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، ج اوّل، ص ٦١)

اسی مفہوم کی دیگر احادیث صحیح بخاری، کتاب الحیض میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے، ترمذی، ابواب الایمان میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے، ابوداؤد، کتاب السنۃ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے اور مسند احمد بن حنبل میں بھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کی روایت سے، موجود ہیں ۔

گویا قرآن وسنت کے صریح احکام کے مطابق دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے یا دوسرے الفاظ میں عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف ہے ۔

© rasailojaraid.com

فقہاء اسلام اور عورت کی گواہی

قرآن وسنت کے واضح احکامات کے مطابق فقہاء اسلام نے مالی معاملات میں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر قرار دیا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن رشد نے اپنی کتاب "بدایۃ المجتہد" میں ائمہ اربعہ کا یہی مذہب نقل کیا ہے:۔

واتفقوا علی انّہ تثبت الأموال بشاھد عدل ذکر وامرأتین لقولہ تعالیٰ "فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ"	اس پر اتفاق ہے کہ مالی معاملات میں ایک عادل مرد اور دو عادل عورتوں کی گواہی معتبر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق کہ "پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں جن کی گواہی تمہیں پسند ہو"۔

(بدایۃ المجتہد ج ۲، ص ۴۶۵ مطبوعہ مصر، ۱۹۶۰ء)

اس بات پر بھی فقہائے کرام کا اتفاق ہے کہ حدود وقصاص کے مقدمات میں عورت کی شہادت معتبر نہیں ہے۔

عورت کی نصف گواہی پر کئے گئے اعتراضات کے جوابات

موجودہ حکومت کی جانب سے مجوزہ "اسلامی قانونِ شہادت" کی تدوین کے دوران میں اور اب اُس کے نفاذ پر بعض لوگوں بالخصوص چند مغرب زدہ خواتین نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ اس گروہ کا موقف یہ ہے کہ ہر معاملے میں مرد کی طرح عورت بھی گواہ بن سکتی ہے اور اُس کی گواہی ہر حال میں مرد کی گواہی کے برابر تسلیم کی جانی چاہیئے اس سلسلے میں عورت کی نصف گواہی کے خلاف جو اعتراضات اس گروہ نے اٹھائے ہیں۔ ذیل میں ہم اُن کے تمام اعتراضات نقل کرکے اُن کے جوابات دیتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

اعتراض ۱۲: مرد اور عورت دونوں ہی انسانیت میں برابر ہیں۔ دونوں ہی یکساں طور پر احترام کے مستحق ہیں لہٰذا ان کی معاشرتی ذمہ داریوں اور سماجی سرگرمیوں میں بھی کسی قسم کی عدم مساوات نہیں ہونی چاہیے اور دونوں کو زندگی کے تمام معاملات میں "دوشانہ بشانہ" حصہ لینا چاہیے۔ بنا بریں، عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کا نصف قرار دینا دراصل عورت کی تذلیل کرنا ہے۔ اسے مرتبۂ انسانیت سے گرانا ہے اور اسے حقیر سمجھنا ہے اور یہ سب کچھ اسلام کے بھی خلاف ہے کیونکہ وہ ہمیں مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔

جواب: اس حقیقت سے کوئی معقول آدمی انکار نہیں کرسکتا کہ شرفِ انسانیت میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں دونوں یکساں طور پر انسان ہیں اور اسلام میں جس طرح مرد کا احترام ہے اُسی طرح عورت کا بھی احترام ہے۔ لیکن ان دونوں کے شرفِ انسانیت میں برابر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دونوں کی معاشرتی سرگرمیاں اور سماجی ذمہ داریاں بھی ایک جیسی ہوں اور ان میں کوئی فرق نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو مختلف جسمانی صلاحیتوں اور مزاجی خصوصیتوں سے نوازا ہے۔ ایک کو "صنفِ نازک" بنایا ہے تو دوسرے کو "صنفِ سخت"۔ ایک کو نسوانیت کا پیکر بنایا ہے تو دوسرے کو مردانگی کا جوہر عطا کیا ہے۔ اسی فطری اختلاف کی بدولت "یکساں طور پر انسان ہونے کے باوصف" دونوں فریق معاشرے میں الگ الگ ذمہ داریاں رکھتے ہیں، دونوں کے حقوق و فرائض مختلف ہو گئے ہیں۔ اور دونوں کا دائرۂ عمل جُدا جُدا ہو گیا ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس نے مرد اور عورت کے اسی اختلافِ صلاحیت و عمل کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ مرد کو خاندان کا سربراہ بنایا گیا ہے۔ اُس پر پورے خاندان کی نگرانی اور معاشی کفالت کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے اور ایک مرد کی صلاحیتیں اسی کی متقاضی ہیں کہ اسے خاندانی زندگی میں یہی مقام دیا جائے۔ اس کے برعکس ایک عورت کو (خواہ وہ بیٹی ہو، بہن ہو، بیوی ہو یا ماں ہو) معاشی جدوجہد سے فارغ کرکے امورِ خانہ سرانجام دینے اور بچوں کی پرورش اور نگہداشت کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اور ایک عورت ہی ان تمام معاملات کو صحیح طور

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

پورا انجام دے سکتی ہے اُس کی فطری صلاحیتیں بھی اسی امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ معاشرتی زندگی میں اُسے یہی منصب عطا ہو[1]۔ یہ ایک فطری نظام ہے اور اس میں صلاحیت و عمل کا اختلاف کسی فرد کے بارے میں بھی احساسِ کمتری پیدا نہیں کرتا، نہ ہی اُسے حقیر جانتا ہے اور نہ ہی انسانی ترقی کے منافی ہے۔ اسلام کے واضح اور صریح احکامات سے یہی تقسیمِ عمل ثابت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص دینِ اسلام کے ان واضح احکام کو نہیں ماننا چاہتا تو اُسے چاہیئے کہ وہ اخلاقی جرأت سے کام لے اور اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کرے۔ اسلام کا نام لے کر اُس کے خلاف عملاً بغاوت کرنا ایک سنگین جرم ہے۔ اور کسی مسلمان کے لئے یہ طرزِ عمل مناسب نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا۔
(الاحزاب ۳۶)

کسی مومن مرد اور کسی مومنہ عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو اس کے بعد اُن کے لئے اس معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے اور جو شخص اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ کھُلی گمراہی میں ہے۔

اب اگر قرآن و سنّت میں ایک عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے نصف قرار دی گئی ہے تو یہ ایک ایسا حکم ہے جس سے کسی مسلمان کے لئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت انکار

---

[1] ممکن ہے بعض خاص حالات میں ایک عورت ہی کسی خاندان کی معاشی طور پر کفیل ہو اور کوئی مرد بطور کفیل نہ ہو۔ مگر یہ ایک استثنائی صورت ہے یہ اسلامی معاشرے کا عام قاعدہ نہیں ہے اور مستثنیات پر عام قوانین کا اطلاق نہیں ہوا کرتا۔ اُن کا معاملہ بالکل الگ ہے اور اُس کا حل بھی دوسرا ہے۔

© rasailojaraid.com

کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس حکم کی حکمت خواہ ہماری محدود اور ناقص عقل کی سمجھ میں نہ آئے، خواہ یہ حکم ہماری خواہشِ نفس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، بہر حال تسلیم کرنا ہوگا۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ عورت کی نصف گواہی اسلام کے ابتدائی دور کے لئے تھی۔ اس وقت کی عورت اتنی باشعور اور ترقی یافتہ نہ تھی اب حالات کے تغیّر سے وہ باشعور اور ترقی یافتہ ہوگئی ہے۔ حالات کے تغیّر سے احکام بدل جاتے ہیں لہذا اب اجتہاد کے ذریعے عورت کی پوری گواہی کو شرعی طور پر تسلیم کر لینا چاہیئے تاکہ حالات کی تبدیلی کے لحاظ سے اسلام کا صحیح منشأ پورا ہو سکے۔

جواب - جہاں تک اس بات کا تعلّق ہے کہ حالات بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں تو اس بارے میں فقہائے اسلام کا یہ متفقہ اصول ہے کہ یہ تبدیلی قرآن و سُنت کے واضح اور منصوص احکام میں نہیں ہو سکتی۔ منصوص احکام ناقابلِ تغیّر ہیں۔ تبدیلی صرف فقہ کے ایک مخصوص دائرے میں ہو سکتی ہے جس کا تعلق لوگوں کے مصالح اور عُرف وغیرہ سے ہو۔ مثال کے طور پر روزانہ پانچ نمازیں فرض ہیں یہ کم و بیش نہیں ہو سکتیں۔ ماہِ رمضان کے روزے فرض ہیں ان کی تعداد گھٹائی یا بڑھائی نہیں جا سکتی۔ زکوٰۃ کی شرح اور نصاب مقرّر ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی کا تعلّق فقہی اجتہادات سے ہے مثلاً ایک زمانے میں کوئی اسلامی حکومت دائرۂ شریعت کے اندر رہتے ہوئے زکوٰۃ جمع کرنے اور اُسے صرف کرنے کا ایک عملی طریق کار وضع کرتی ہے۔ یہ عملی طریق کار حالات کے تغیّر سے بدلا جا سکتا ہے، کسی اور زمانے کی اسلامی حکومت کوئی نیا عملی طریق کار بنا کر اُس پر عمل پیرا ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ نظام زکوٰۃ کا عملی طریق کار منصوص نہیں ہے لہذا اسے حالات کے مطابق بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن جو امر منصوص ہوگا اُس میں تبدیلی کا امکان نہ ہوگا۔

اب جہاں تک عورت کی نصف گواہی کا معاملہ ہے تو یہ ایک امر منصوص ہے اور قرآن و سنت کے واضح احکامات سے ثابت ہے۔ یہ کوئی اجتہادی یا انتظامی معاملہ نہیں ہے کہ اس میں تغیّر ممکن ہو۔ لہذا عورت کی نصف گواہی کا حکم تا قیامت قائم رہے گا۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

البتہ جو لوگ قرآن و سنت کے واضح اور صریح احکام کو اپنی خواہشِ نفس کے تابع رکھ کر یا حالات کے دباؤ میں آکر انہیں موم کی ناک بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ جس طرح چاہیں جب چاہیں ان کو بدل کر رکھ دیں تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالٰی اُن کو اُن کے اس ارادے میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (یونس ۱۷) بلا شبہ مجرم لوگ فلاح نہیں پا سکتے۔

۳ - اس سلسلے کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ موجودہ قانون شہادت میں عورت کو گواہی کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے - اور اب وہ اس حق تلفی کی وجہ سے بجا طور پر احتجاج کر رہی ہے۔

© rasailojaraid.com

جواب : گواہی دینا سرے سے کوئی حق (RIGHT) نہیں ہے جس کے تلف ہونے پر کوئی شخص مضطرب ہو - عدالتی شہادت تو مردوں کا بھی حق نہیں ہے بلکہ یہ ایک فرض (DUTY) ہے جو عائد کیا گیا ہے - دنیا کے کسی مذہب اور قانون نے گواہی کو حق تسلیم نہیں کیا ہے - بلکہ اسے ایک ذمہ داری قرار دیا ہے - تعجب ہے کہ آج کی بعض خواتین (جن کو مرد نما خواتین کہنا زیادہ مناسب ہے) سڑکوں پر جلوس نکال کر یہ احتجاج کرتی پھرتی ہیں کہ اُن کو اُن کے "حق" سے محروم کر دیا گیا ہے - حالانکہ وہ اگر غور فرمائیں تو اُن کے معاملے کی یہ صورت ہے کہ :

وہ پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہیں کہ قانون اُن پر گواہی کی ذمہ داری کیوں عائد نہیں کرتا ہے کیوں نہیں اُن پر گواہی کی ذمہ داری کا بوجھ ڈالا جاتا ؟ ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

اسلام نے اگر صنفِ نازک پر ادائے شہادت کی بھاری ذمہ داری نہیں ڈالی تھی تو یہ اُس کا عورت پر احسانِ عظیم تھا کہ ایک جانِ ناتواں کو اس بارِ گراں سے سبکدوش رکھا گیا - شہادت دینا کوئی انسانی حق (HUMAN RIGHT) نہیں تھا، جسے عورت سے چھین لیا گیا ہو اور جس کی محرومی پر اُسے واویلا کرنا چاہیئے تھا - بلکہ یہ تو ایک فریضہ ہے جسے اوّل تو اسلام نے عورت پر عائد ہی نہیں کیا اور اگر کبھی کیا بھی ہے تو اس کے ساتھ ایک اور گواہ عورت کا سہارا بھی دے دیا ہے - مگر شاید یہ بھی دانش

© rasailojaraid.com

نسوانی کی بوالعجبیوں میں سے ہے کہ وہ کسی حق کی محرومی پر نہیں بلکہ ایک ذمہ داری کے اُس پر عائد نہ کئے جانے پر آج سراپا احتجاج بنی ہوتی ہے - ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

۴ - چوتھا اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید میں سورۃ بقرہ کی آیت دین (۲۸۲) میں جہاں مرد اور عورت کی گواہی کا ذکر آیا ہے وہاں ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ "ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے" گویا اصل میں گواہ تو ایک ہی عورت ہوگی، دوسری عورت صرف مذکرہ یاد دہانی کرانے والی (REMINDER) ہوگی - لہذا عورت کی گواہی از روئے قرآن مرد کی گواہی کے بالکل برابر نہیں بلکہ اس کا نصف [illegible] ہے -

جواب : یہ ایک سطحی اعتراض ہے جو صرف عربیّت اور قرآن فہمی دونوں سے عاری ذہن ہی میں پیدا ہو سکتا ہے - اس کا مبدأ قرآن کے اُردو یا انگریزی تراجم کے حوالے سے قرآن کے قانون کو سمجھنے کی عادت ہے - اللہ تعالیٰ نے اس آیت زیر بحث میں گواہی کے دو نصاب مقرر فرمائے ہیں - ایک یہ کہ قرض کے معاملے میں دو مرد بطور گواہ ہونے چاہئیں اور آیت کے الفاظ "وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ" (اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ بنالو) میں یہی نصاب مذکور ہوا ہے - دوسرا نصاب شہادت یہ بیان ہوا ہے کہ :

فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ — پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد

فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ - — دو عورتیں ہوں -

یعنی ایک مرد اور دو عورتیں - گویا ایک مرد کی بجائے دو عورتیں گواہ بنالی جاتیں - دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہو گی یا ایک عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف ہے - دوسرے نصاب کی رُو سے دونوں عورتیں گواہ ہوں گی - قرآن نے شہادت کے یہی دو نصاب بیان فرمائے ہیں -

تمام مفسرین کے نزدیک قرآن میں شہادت کے یہی دو نصاب بیان ہوئے ہیں اور یہ بات کہ دوسرے نصاب کی رُو سے دونوں عورتیں بطور گواہ ہونگی، خود قرآن مجید کے متن اور کتب تفاسیر کی تصریحات سے بالکل واضح ہیں - مثال کے طور پر ہم یہاں پر چند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوالے نقل کریں گے۔

(ا) "احکام القرآن" میں ابن عربیؒ تحریر فرماتے ہیں:

فاذا کانت امرأتان و	جب دو عورتیں ہوں گی اور ایک
ذکرت احداھما الأخری	دوسری کو یاد دلا دے گی تو ان
کانت شھادتھما شھادۃ	دونوں عورتوں کی شہادت ایک
رجل واحد، کالرجل	مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیگی
یستذکر فی نفسہ	جیسے کوئی مرد اپنے حافظے پر زور
فیتذکر۔	دے کر کوئی بات دوبارہ یاد کر لیتا
(احکام القرآن، ج ۱، ص ۲۵۵)	ہے۔

© rasailojaraid.com

(ب) تفسیر "معارف القرآن" میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی اسی آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"اور اگر گواہی کے لئے دو مرد میسر نہ آئیں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہی کے لئے کافی ہیں بشرطیکہ یہ سب ان لوگوں میں سے ہوں جن کو تم گواہ بنانے کے لئے پسند کرتے ہو۔ یعنی ثقہ اور امین ہوں، فسق و فجور اور بے مروتی سے متہم نہ ہوں اور نہ دونوں میں کوئی ایسی قرابت ہو کہ جو شبہ اور تہمت کا باعث ہو۔ اور ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کا ہونا اس لئے شرط کیا گیا کہ شاید ایک عورت اپنی فطرت غفلت اور ذاتی قصورِ عقلی کی وجہ سے واقعۂ شہادت کے کسی جزء کو بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلائے اور اس طرح شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے"

(معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی، ج اول، ص ۴۲۵)

(ج) تفسیر "تدبر قرآن" میں مولانا امین احسن اصلاحی اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ آسکیں تو اس کے لئے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اس لئے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہوگا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اس کا سدباب ہو سکے گا۔ یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں ہے بلکہ اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے

© rasailojaraid.com

حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمّہ داری اس کے لئے ایک بھاری ذمّہ داری ہے اس وجہ سے شریعت نے اس کے اُٹھانے میں اس کے لئے سہارے کا بھی انتظام فرما دیا ہے"۔
(تدبّر قرآن، ج اوّل، ص ۵۹۰)

اسی ضمن میں ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ بالفرض دو عورتوں میں سے کسی ایک کا شاہدہ (گواہ) ہونا اور دوسری کا مذکّرہ (یاد دہانی کرانے والی) ہونا کیسے طے ہوگا؟ کیونکہ قرآنی عبارت کی رُو سے دونوں ہی شاہدہ اور دونوں ہی مذکّرہ ہو سکتی ہیں۔ بلکہ قرآن کے الفاظ میں تو بھول جانے والی شاہدہ ہی کو مذکّرہ کہا گیا ہے۔ لہٰذا کسی ایک کو شاہدہ (گواہ) اور دوسری کو مذکّرہ ٹھہرانا خود قرآن کے الفاظ اور مفہوم دونوں کے خلاف ہے۔

(۵) پانچواں اعتراض یہ ہے کہ 'لعان' کی صورت میں بھی عورت اور مرد کی گواہی کو برابر تسلیم کیا گیا ہے اور قرآن میں اس کے لئے لفظِ 'شہادت' آیا ہے۔ لہٰذا عورت اور مرد کی گواہی برابر ہے اور ان میں کوئی فرق کرنا روا نہیں ہے۔

جواب: ہمارے نزدیک لعان کو شہادت قرار دینا اصولی طور پر غلط ہے اور یہ قیاس مع الفارق ہے کہ لعان کی بنیاد پر عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے برابر ٹھہرایا جائے۔ اس بارے میں درج ذیل دلائل دیئے جاتے ہیں۔

ا۔ حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں لعان اور شہادت کے الگ الگ ابواب آتے ہیں اور کہیں بھی ان کو ایک نہیں سمجھا گیا بلکہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے مختلف امر سمجھ کر جُدا جدا بیان کیا گیا ہے۔

ب۔ حضرت ماعز اسلمی کے رجم سے متعلق احادیث میں بھی شہادت کا لفظ آیا ہے مگر یہ اصطلاحی شہادت کے معنوں میں نہیں ہے بلکہ اقرار، حلف بالیمین اور اقبالِ جرم کے معنوں میں ہے اور عربی زبان میں شہادت کا لفظ ان معنوں میں بھی آتا ہے۔ صحیح بخاری کے الفاظ

"فشهد على نفسه اربع شهادات" (پھر اُس نے (حضرت ماعز نے) چار مرتبہ اپنے خلاف قسم کھائی (کہ اُس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے)۔)

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

فقہاءِ اسلام نے حضرت ماعزؓ کی اس "شہادت"، "شہادات" کو اصطلاحی "شہادت"، نہیں مانا ہے بلکہ "حلفیہ اقرارِ جرم" تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا محض لفظِ شہادت کے استعمال سے وہ قانونی اور اصطلاحی شہادت مُراد نہیں لی جا سکتی جو کسی مقدمے میں مدعی اور مدعا علیہ کے علاوہ ایک تیسرا شخص ثبوتِ دعوٰی یا خلافِ دعوٰی گواہی دیتا ہے۔

ج ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الامّ" میں لعان کو شہادت کی بجائے یمین قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ۔

"الشھادۃ ھنا یمین"	(لعان میں، شہادت سے مراد یمین (اپنے بارے میں حلفیہ بیان) ہے۔
(کتاب الامّ، ج ۵، ص ۱۳۴)	

د ۔ احکام القرآن میں ابن عربیؒ تحریر کرتے ہیں کہ :

والفیصل فی انھا یمین، لا شھادۃ ۔	دوٹوک بات یہی ہے کہ یہ (لعان) یمین (اپنے بارے میں حلفیہ بیان) ہے شہادت نہیں ہے ۔
(احکام القرآن، ج ۳، ص ۱۳۴۴)	

۶ ۔ چھٹا اعتراض یہ ہے کہ ایک عورت کا بیان اگر حدیث کی روایت کرنے میں معتبر ہے تو مقدمات میں اُس کا قول کیوں غیر معتبر یا نصف ہو۔ مثال کے طور پر اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ سے بکثرت احادیث مروی ہیں اور اُمت نے آپ کو ثقہ اور عادل راویہ تسلیم کیا ہے ۔ تو کیا مقدمات میں حضرت عائشہؓ کی گواہی معتبر نہ تھی یا نصف قرار دی گئی تھی ؟

جواب : ادائے شہادت اور روایتِ حدیث کو ایک سمجھنا بنیادی طور پر صحیح نہیں ہے۔ یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں اور ان کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا غلط ہے ان دونوں کا مختلف ہونا درج ذیل شواہد سے واضح ہو جاتا ہے ۔

ا ۔ حدیث اور روایت میں خبرِ واحد بھی معتبر اور حجت ہوتی ہے ۔ ایک آدمی خواہ وہ مرد ہو یا عورت، صحابی ہو یا غیر صحابی اگر وہ ثقہ اور عادل ہونے کی اہلیت رکھتا ہو تو اُس کی روایت قبول کی جاتی ہے لیکن اگر وہی راوی کسی ایسے مقدمے میں تنہا

© rasailojaraid.com

گواہ بن کر کسی قاضی کے سامنے جاتا ہے جس میں دو یا چار گواہوں کا نصاب ضروری ہے تو باوجود اُس راوی کی ثقاہت و عدالت کے قاضی اُس کی تنہا گواہی پر کسی ملزم کو نہ تو مجرم قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی اُسے سزا دینے کا مجاز ہے۔

تاریخ الخلفاء میں علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی ایک زرہ اپنے عہدِ خلافت میں گم ہو گئی، اتفاق سے وہی زرہ آپ نے ایک یہودی کے پاس دیکھ لی اور پھر عدالت میں اُس کے خلاف دعویٰ دائر کیا۔ اس پر قاضی شریح نے حضرت علیؓ سے ثبوت طلب کرتے ہوئے دریافت کیا۔

أَلَكَ بَيِّنَةٌ يا امير المؤمنين۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۸۱) — امیر المومنین! کیا آپ کے پاس اس (دعوے) کا کوئی ثبوت ہے؟ (کہ یہ زرہ اسی یہودی نے چرائی ہے)

سوال یہ ہے کہ کیا حضرت علیؓ اگر کوئی حدیث بیان فرماتے تو پھر بھی آپ سے کوئی شخص یہ پوچھ سکتا تھا کہ "جناب! اس حدیث کا ثبوت لائیے، ورنہ آپ کی روایت کردہ حدیث کو قبول نہیں کیا جا سکتا"؟ یہ تو صرف مقدمات میں ہے کہ ایک قاضیٔ عدالت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق کہ:

البينة على المدعى — مدعی پر بارِ ثبوت ہے۔

بڑے سے بڑے صحابی سے بھی اُس کے دعوےٰ کے حق میں ثبوت طلب کر سکتا ہے۔ جبکہ روایتِ حدیث کا معاملہ یہ ہے کہ محدثین کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ:

الصحابة كلهم عدول۔ — تمام صحابہ (روایت میں) عادل ہیں۔

اور کسی صحابی پر روایتِ حدیث کے باب میں کوئی جرح نہیں ہو سکتی۔ یہ اسلامی قانون ہے کہ کسی ایک صحابی یا تابعی کی شہادت پر نہ کسی ملزم پر حدِّ قذف جاری کی جا سکتی ہے نہ اُس پر حدِّ زنا قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اُسے رجم کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کے لئے چار صحابی یا چار تابعی یا چار دوسرے عادل گواہوں کی شہادت درکار ہے اس کے بغیر حد کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ روایتِ حدیث اور چیز ہے اور ادائے شہادت

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اور یہ چیز ہے۔

(ب) روایتِ حدیث میں یہ بات نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوتی ہے کہ ایک راوی یہ بتائے کہ "اخبرنا فلان عن فلان" (میں نے یہ حدیث فلاں سے سُنی ہے، اور اس نے فلاں سے سُنی ہے)۔ یہاں محض سماع بلکہ صحیح تر لفظوں میں "سماع علی السماع" بھی نہ صرف یہ کہ معتبر ہے بلکہ صحتِ حدیث کا ضامن ہے۔ لیکن کیا اسی سماع یا سماع علی السماع کو کوئی عدالت بھی بطور شہادت قبول کر سکتی ہے۔ جبکہ فقہائے اسلام کا اس امر میں اتفاق ہے کہ تمام مقدمات میں سماعی شہادت کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور ادائے شہادت کے لیئے ضروری ہے کہ واقعہ کا چشم دید گواہ موجود ہو ورنہ محض سُنی سنائی شہادت ہرگز معتبر نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

لہٰذا روایتِ حدیث اور عدالتی شہادت کو ایک سمجھنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ اور اسکی بنیاد پر عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے برابر ٹھہرانا قیاس مع الفارق ہے۔

۷۔ اس سلسلے کا ساتواں اعتراض یہ ہے کہ اگر عورتوں کو مختلف مقدمات میں گواہ بننے سے روک دیا جائے۔ یا اُن کی گواہی کو آدھی گواہی مانا جائے تو یہ امر معاشرے میں جرائم کے اضافے کا موجب ہوگا۔

جواب: یہ ایک غلط فہمی ہے جو اسلام کے نظامِ قانون و عدالت کے بارے میں بے اعتمادی کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر فی الواقع ہمارے معاشرے میں اسلامی حدود و تعزیرات کو لفظاً و معناً (In letter & spirit) پورے خلوص کیساتھ نافذ کیا جائے اور صرف مردوں کی شہادت ہی کو تسلیم کر لیا جائے تو ہم پورے وثوق سے یہ دعوے کرتے ہیں کہ اسلام کی عبرتناک سزاؤں کی بدولت صرف ایک سال کے اندر اندر جرائم کا تقریباً خاتمہ ہو سکتا ہے۔

اس دنیا میں سعودی عرب اور امریکہ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے ایک ملک میں عورت کی عدمِ شہادت یا نصفِ شہادت ہے اور جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دوسرے ملک میں عورت کی پوری شہادت ہے مگر وہاں جرائم کی شرح خوفناک حد تک بڑھ چکی ہے۔

© rasailojaraid.com